اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور امریکی صیہونی عزائم
ایک تنقیدی جائزہ

ڈاکٹر خالد علوی*

یہ ایک اہم موضوع ہے لیکن اس عنوان کے ایک حصہ میں مغالطہ ہے جس کی وضاحت ضروری ہے۔ نشاۃ ثانیہ کی بات اتنی بار دہرائی گئی ہے کہ اس کی حیثیت ایک اصطلاح اور ایک نعرہ کی سی ہوگئی ہے۔ اس طرح امریکی صیہونی عزائم کے بارے میں اتنا کچھ کہا گیا ہے اور اتنا عمومی انداز اختیار کیا ہے کہ اس کی سنگینی نظرانداز ہوگئی ہے۔

اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ موضوع کا ایک تنقیدی جائزہ لیا جائے۔ خاص طور پر نشاۃ ثانیہ کی اصطلاح کا جاننا ضروری ہے۔

نشاۃ ثانیہ

ہمارے ہاں کے مصنفین نے اس اصطلاح کو بہت استعمال کیا ہے لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ اصطلاح جو یورپ میں احیاء علوم کے حوالے سے پہچانی گئی اور جس کی بنیاد پر ایک تحریک بپا ہوئی اور ایک تصور مستحکم ہوا' جب ہمارے ہاں اسے پڑھا اور سمجھا گیا تو اسے خاص مفہوم دیا گیا۔ احیاء اسلام کے بالعموم حوالے سے نشاۃ ثانیہ ہی کی بات ہوگی۔ انگریزی کا لفظ Renaissance جس کا ترجمہ نشاۃ ثانیہ کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر ایک فرانسیسی اصطلاح ہے جس کے معنی دوبارہ پیدا ہونے کے ہیں۔ یونانی اور رومی اساطیر میں اور عیسائی کلیسا میں یہ تصور موجود تھا کہ کسی ہیرو میں اچانک اور معجزاتی طور پر دوبارہ طاقت پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی طرح سوسائٹی میں بھی قوت دوبارہ زندہ و بحال کی جاسکتی ہے۔ اناجیل کی تصنیف کے دور سے یہ

---

* سیرت پروفیسر' ادارہ علوم اسلامیہ' پنجاب یونیورسٹی

تصور چلا آیا ہے کہ مسیح کی ذات کے حوالے سے روح کی دوبارہ پیدائش ہوسکتی ہے (Rebirth of Soul in Christ)- مغرب کے سیکولر اور عیسائی ذہن میں سنہری دور کے آنے اور فرد و معاشرے میں خدائی حلول اور دوبارہ تازہ ہونے کا تصور موجود تھا۔

چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں اٹلی میں آرٹ اور لٹریچر میں ترقی کے سلسلے میں ایک بیداری پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں انہوں نے اپنے دور کا سابقہ دور سے موازنہ کیا اور ہیومینسٹ (Humanist) حلقوں میں ایک تاریخی تقسیم کا تصور پیدا ہوا جس کے مطابق' زوال روما اور ان کے عہد کے درمیان کا عرصہ < تاریک دور" (Dark Ages) کہلایا۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں کلاسیکل تہذیب کا مشاہدہ ہوا ہے۔ اسی عہد میں تاریخ کے ادوار کی تقسیم کا تصور پیش ہوا۔ جس کے مطابق تاریخ کے تین ادوار قرار پائے۔ قدیم' وسطی اور جدید (Modern Ancient, Medieval and) یہ تصور مغربی دنیا کا ایک مقبول تصور ہے۔ نئے تجربے کا جو شعور اٹلی کے لوگوں کو حاصل ہوا وہ جلد ہی پورے مغربی یورپ میں بھی منتقل ہوا۔ سولھویں صدی عیسوی میں اس تصور نے پورے یورپ کو اپنی گرفت میں لے لیا اور تخلیق و اکتشاف کا نیا سنہری دور سامنے نظر آنے لگا۔ اور اس دور کی روح انفرادیت پسندی (Individualism) ہے۔ یونانی علوم' لاطینی زبان اور قدیم عیسائی مذہبی' نصوص کا مطالعہ اس دور کی اہم خصوصیت ہے۔

یہاں ایک اور عیسائی اصطلاح کی طرف بھی توجہ دینا ضروری ہے جس کا ہمارے موضوع سے گہرا تعلق ہے۔ وہ ہے ہزار برس کے بعد کا نیا دور (Millenium) اس تصور کے مطابق مسیح کی مصلوبیت کے ایک ہزار سال بعد ایک نیا دور شروع ہوگا۔ اگرچہ اناجیل اربعہ میں اس تصور کا ذکر نہیں تاہم غیر مستند کتابوں میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔ ابتدائی کلیسا میں یہ تصور تھا کہ دنیا ختم ہونے والی ہے۔ مسیح کا دوبارہ ظہور ہوگا اور انٹی کرائیسٹ (Anti Christ) کو تباہ کردیا جائے گا۔ اس کا اہم پہلو یہ ہے کہ روئے زمین کو نئی زندگی ملے گی اور یروشلم کو دوبارہ تعمیر کیا جائے گا اور اس کی شان بڑھے گی۔ روئے زمین پر جنت کا نقشہ ہوگا کوئی غم ہوگا نہ تکلیف ہر طرف خوشی اور اطمینان ہوگا۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلی جن اینڈ اینتھکس کا مقالہ نگار لکھتا ہے :

The doctrine has given rise to separate sects (Seventh Day Adventists, Second and Adventists etc.) These as well as Millinarians of the Early Church, belive that at the close of the 1000 years, Satan will be unbound and that he will make war against the Saints, only to be destroyed (1)

اس تصور میں یروشلم کی مرکزیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ یروشلم کے دوبارہ تعمیر ہونے اور مسیح کے وہاں آنے کے اس تصور کو یہودیوں نے خوب پھیلایا۔ یہی مقالہ نگار لکھتا ہے :

Doubtless a misunderstanding of Apocalypse gave the belief a certain authority, but it is rather from its Jewish antecedents that its popularity and the elaboration of its details are to be explained. (۲)

مسلمانوں کے ہاں اس طرح کا تصور میرے علم کے مطابق کہیں نہیں ہے۔ برصغیر میں اکبر کو اس کے بعض خود غرض درباریوں نے یہ سمجھایا تھا کہ ہزار سال کے بعد نئے مذہب کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اس نے دین الٰہی کی بنیاد رکھی جو اس کے ساتھ ہی دفن ہوگیا۔ یا مجدد الف ثانیؒ کی مثال ہے۔ انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ دوسرے ہزار سال کے مجدد ہیں اور ان کے ذمہ تجدید دین کا فریضہ لگایا گیا ہے۔ انہوں نے برصغیر میں مغلوں کے عہد میں پھیلنے والے الحاد اور ہندوانہ فکریات و رسوم کے غلبے کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کے دعویٰ کی اساس ان کا روحانی شعور اور صوفیانہ واردات ہے جسے جانچنے کا کوئی واضح معیار ہمارے پاس نہیں۔ اگر کسی صوفی کا الہامی دعویٰ شرعی نصوص یا دین کے عمومی مزاج کے خلاف ہو تو اسے رد کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی لیکن اگر اس کی کوئی تعبیر دین کے خلاف نہ جاتی ہو تو اس کے رد و قبول میں فیصلے کی گنجائش ہوتی ہے۔ شیخ مجددؒ کا خیال تھا کہ انہیں قدرت کی طرف سے اس کام پر مامور کیا گیا ہے اور وہ شریعت محمدی کے غلبے کے لیے مصروف عمل ہیں۔ برصغیر کے دینی حلقوں نے ان کے ساتھ جزوی اختلاف کے باوجود ان کے کام کو پذیرائی دی اور ان کی شخصیت کو دینی و ملی روایت میں ایک اہم مقام عطا کیا۔ میرے محدود مطالعہ کے مطابق ہزار سال کے حوالے سے اسلامی ادب میں اس کے علاوہ کوئی مثال نہیں ملتی۔

مسلمانوں کی تاریخ میں جو تصور مقبول رہا ہے اور جس پر علامہ اقبالؒ، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اور دیگر کئی مصنفین نے اظہار خیال کیا وہ تجدید دین کی اصطلاح ہے جسے ہمارے علماء نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔ اس کی بنیاد ابو داؤد کی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

عن ابی ھریرۃؓ قال : قال رسول اللّٰہؐ ان اللّٰہ یبعث لھذہ الامۃ علی راس کل مائۃ من یجدد لھا دینھا (۳)۔

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی کے سر پر ایسی ہستی مبعوث کرے گا جو اس کے لیے تجدید دین کا کام کرے گی۔

اگرچہ اقبال نے س حدیث کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا ہے تاہم اسے علماء نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے۔

سید مودودیؒ کی کتاب "تجدید و احیاء دین" ایک اہم کتاب ہے اور تجدید دین کے حوالے سے ہونے والے کام کا ایک ایسا جائزہ ہے جسے اسلام اور تحریک اسلامی کے کام کی ذرا سی سوجھ بوجھ رکھنے والے انسان بھی نظر انداز نہیں کرسکتا۔ بلکہ غلبہ اسلام کے لیے کام کرنے والا کوئی شخص اس کتاب اور اس کے مندرجات (Contents) سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

سید مرحوم نے اس کتاب کا نام "تجدید و احیاء دین" رکھا۔ اس میں احیاء کی اصطلاح ایسی ہے جو قدیم مصنفین کے ہاں بھی مختلف معنوں میں استعمال ہوتی رہی ہے۔ لیکن ہمارے محدود مطالعہ کے مطابق اسلام کے بارے میں کبھی بھی، کسی موقع پر اور کسی دور میں بھی یہ تصور نہیں رہا کہ اسلام مردہ ہوگیا ہے اور اسے دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اقبال نے اسلام کے حوالے سے جو بات کہی ہے وہ بہت صحیح ہے۔ وہ کہتے ہیں:

> "ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام کے مطالعہ سے سیکھا ہے یہ ہے کہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا نہ کہ مسلمان۔ مسلمان اگر آج اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جمادیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سر نو جمع ہوجائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت اور بربادی سے محفوظ ہوجائے گا"(۴)۔

اس لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے ہاں کبھی یہ تصور نہیں رہا کہ اسلام مرگیا ہے یا اس کی روشنی بجھ گئی ہے لہٰذا اس کو دوبارہ اٹھانے کی ضرورت ہے اور اس کی نشاۃ ثانیہ مطلوب ہے۔ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ یا ثالثہ کی بات ہوسکتی ہے کہ وہ بار بار ڈوب کر ابھرے ہیں۔ لیکن اسلام آج تک نہیں ڈوبا۔ اسلام کے مرنے اور ڈوبنے کا تصور قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن نے تو کہا ہے: "اسے تمام دینوں پر غالب ہونا ہے"(۵) اس لیے یہ کبھی مر نہیں سکتا، کبھی مٹ نہیں سکتا۔

ہمیں اس اصطلاح میں واقع لفظ "ثانیہ" پر غور کرنا چاہئے۔ جس کے معنی دوبارہ کے ہیں گویا اسلام کو دوبارہ اٹھنا ہے۔ یہ بات Millennium کے تصور سے ملتی جلتی ہے جو مسیحی تصور ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو وہ ایک قوت کے طور پر، ایک نظری فکری اور فلسفی نظام کے اعتبار سے ہمیشہ زندہ و پائندہ و جاوید رہا ہے اور ان شاء اللہ رہے گا۔

تجدید کی جو بات حضور اکرمؐ کی طرف منسوب ہے وہ اس اعتبار سے بڑی اہم ہے کہ اس

میں تصفیہ و تزکیہ کا ایک خودکار نظام (Self Regulatory System) موجود ہے۔

سید مرحوم نے بھی کہیں نہیں لکھا اور متکلمین اسلام کے لٹریچر کا مطالعہ کرنے والوں پر بھی واضح ہے کہ حضورؐ کی طرف ایک جملہ منسوب ہے' جو اس تصور کی تشریح و توضیح کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ان امتی لا تجتمع علی ضلالة[٦] میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی۔

اس سے ہمارے متکلمین نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ملت اسلامیہ کا اجتماعی شعور کبھی تباہ و برباد نہیں ہوگا۔ اسلام کی بقا' ختم نبوت کی حفاظت اور اسلام کے فکری غلبے کی بنیادی علامت یہ ہے کہ امت مسلمہ کا اجتماعی شعور کبھی کسی گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگا۔ اس کے ہاں الحادی تحریکیں چلیں گی' انحرافی گروہ پیدا ہوں گے' گمراہیوں اور بدعات کا فروغ بھی ہوسکتا ہے لیکن یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ امت مسلمہ کسی گمراہی' کسی بدعت اور کسی الحادی فکر پر مجتمع ہوجائے۔ یہ اس کے تزکیہ کا خودکار نظام ہے جس کے تحت شخصیات انفرادی طور پر اور گروہ اجتماعی طور پر تطہیر و تجدید کا کام کرتے رہیں گے اور اسلام کا چشمہ صافی کبھی گدلا نہیں ہوگا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری تاریخ میں کبھی ایک فرد اٹھتا ہے اور وقت کے اندھیروں اور زمانہ کی تاریکیوں کے خلاف مصروف جہاد ہوتا ہے اور اسلام کے نور کو چہار سو پھیلا دیتا ہے۔ اس کی ایک تازہ مثال سید مودودیؒ کی کاوشیں ہیں۔ ان کی وفات پر کسی نے مضمون لکھا تھا جس کے سرنامہ پر ایک شعر تھا جو حقیقت حال کو واضح کردیتا ہے۔

جنم جنم کے اندھیروں کو دے رہا ہے شکست
وہ اک چراغ کہ اپنے لہو سے روشن ہے

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اجتماعی قیادتیں یہ کام کرتی ہیں۔ افراد کا ایک گروہ اور کارکنوں کی ایک جماعت اسی اندھیرے اور تاریکی کے خلاف اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے نور کی شعاعیں پھوٹنے لگتی ہیں اور اندھیرے پسپائی اختیار کرتے ہیں۔ اس بنا پر تجدید کی اصطلاح کو تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور ثالثہ و رابعہ بھی ہوسکتی ہے لیکن اسلام کے لیے نشاۃ ثانیہ کی اصطلاح کے لیے کچھ تحفظات ہیں جن کی بنا پر اس اصطلاح کے استعمال میں احتیاط ضروری ہے۔ تاہم عملی طور پر ایک رائے اور ایک تجزیہ ہے۔ اس اصطلاح کے استعمال کے حق میں دلائل ہوں تو انہیں دیکھا جاسکتا ہے اور قبول بھی کیا جاسکتا ہے۔

امریکی صیہونی عزائم

موضوع کا دوسرا حصہ "امریکی صیہونی عزائم" ہے۔ اسے جانچنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے کئی منہاج ہوسکتے ہیں۔ تاریخی، واقعاتی، فکری اور درسی۔ اور ظاہر ہے کہ ایک مدرس تدریسی انداز سے ہی تجزیہ کرسکتا ہے۔ امریکہ کی سازشوں اور امریکی عزائم کی بات اتنی عام ہے کہ ہمارے ہاں ہونے والی معمولی بات بھی امریکہ کی طرف منسوب کر دی جاتی ہے۔ کوئی ناگوار حادثہ ہے تو آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس میں کوئی امریکی صیہونی سازش نظر آتی ہے۔ یہ انداز اتنا عام ہوا ہے کہ اب ایک مذاق کی بات بن گئی ہے غالباً ایسا اس لیے ہے کہ امریکی صیہونی سازشیں ایک بدیہی حقیقت بن گئی ہیں اور اس کے لیے کسی بڑے استدلال کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے جسے عام طور پر نظر انداز کردیا جاتا ہے اور وہ ہے اپنی کم احتسابی کا رویہ۔ بدقسمتی سے ہم ایسے گروہ کی حیثیت اختیار کرگئے ہیں جو اپنے اعمال اور اپنی حرکتوں کا تجزیہ کرنا پسند نہیں کرتا۔ ہم جان بوجھ کر اس امر سے بے خبری کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ ہم خود کیا کر رہے ہیں۔ یہ ایک بہت آسان معاملہ ہے کہ ہم کہہ دیں کہ فلاں شخص یا فلاں گروہ کی وجہ سے ہمارے ساتھ یہ ہورہا ہے لیکن اگر ہم اپنا احتساب کرلیں تو اس میں کوئی حرج نہیں اور یہ دیکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ جو بات کہی جارہی ہے وہ درست ہے یا غلط یا جو کچھ ہو رہا ہے اس کا جائزہ لے لیں کہ اس میں کوئی حقیقت بھی ہے یا نہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ ہمارے بارے میں امریکی صیہونی عزائم ہیں۔ ہمارے خلاف یا مسلمانوں کے خلاف کوئی منصوبہ بندی ہے۔ کیا حرج ہے کہ ہم جائزہ لے لیں کہ امریکہ کیا ہے؟ اور وہ کیا چاہتا ہے؟ صیہونیت کیا ہے؟ اور وہ کیا چاہتی ہے؟ اردو میں صیہونیت پر بہت سی کتابیں میسر ہیں۔ انگریزی میں اس پر جو لٹریچر ہے اس کی تو کوئی حد نہیں۔ Elders of Zion کے نام سے ایک ڈائری چھپی ہے جس کے بارے میں یہودیوں کا کہنا ہے کہ وہ جعلی ہے۔ ان کے مخالفوں نے اسے لکھ کر ان کی طرف منسوب کردی ہے۔ جن لوگوں نے اس ڈائری کو پڑھا ہے اور پھر ان حالات کا جائزہ لیا ہے جو عالمی سطح پر ہو رہے ہیں یا مسلم ممالک میں جو ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں تو وہ یقیناً کہیں گے کہ ان حالات سے تو ایسے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر یہ ڈائری جعلی ہے تو بھی یہودیوں کے دماغ کو ٹھیک طور پر پڑھ کر بنائی گئی ہے۔ کیونکہ اس میں کہی گئی ایک بات درست ثابت ہو رہی ہے۔

صیہونیت کے بارے میں ایک بنیادی نقطہ ذہن میں رہنا چاہیے تاکہ اس کے متعلق ہونے والی تمام باتیں صاف صاف سمجھ آئیں۔ وہ یہ ہے کہ صیہونیت بنیادی طور پر ایک قومی اور نسلی تحریک (Nationalist Racist Movement) ہے۔ صیہونی یہودیوں کا نعرہ تھا: صیہون کو

واپس جاؤ (Back to Zion) صیحون جو یروشلم میں جیبوسائٹ (Jebusite) ایک مضبوط دفاعی مرکز تھا جس پر داؤدؑ نے قبضہ کیا تھا۔ یہ غالباً مشرقی پہاڑی کے جنوبی حصے میں تھا۔ اس پر ایک عبادت گاہ بنائی گئی تھی اور بعد میں پوری پہاڑی کو Zion کا نام دے دیا گیا تھا۔ بعد کی تاریخ میں یروشلم کے شہر کو اس کے ہم معنی سمجھا گیا جس کے شہریوں کو صیون کی بیٹیاں (Daughters of Zion) کہا گیا۔ یہودیوں کے نسلی اور قومی مزاج میں یروشلم کی واپسی ایک آرزو اور ایک امنگ کے طور پر قائم رہی۔ سولہویں صدی میں نبوت کے مدعی داؤد روبنی (David Rubeni) اور اس کے ہیرو سلیمان مالکو (Soloman Molcho) نے یورپ میں یہودیوں کی آزادی کا نعرہ لگایا اور اس شخص کو اٹلی، سپین اور ترکی میں بڑی پذیرائی ہوئی۔ سترھویں صدی میں انگریز ملنیریئنز (Millanaiars) نے یہودیوں کی قومی امنگوں کو تقویت پہنچائی اور یہودیوں کو انگلستان میں رہائش کی سہولتیں میسر آئیں۔ یہ ایک طرح کی بنیاد تھی جہاں سے انہوں نے اپنے قومی وطن فلسطین میں جا کر آباد ہونا تھا۔ ۱۶۶۶ء میں ایک یہودی شخص سباتی سیبی (Sabbatai Sebi) ۱۶۲۶ء - ۱۶۷۶ء نے مسیح ہونے کا دعویٰ کیا اور سمرنا (Smyrna) سے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ دیکھتے دیکھتے اس کے اثرات پورے مغربی یورپ میں پھیل گئے اور ہر علاقے کے یہودی فلسطین کی طرف ہجرت کو تیار ہوگئے۔ اگرچہ یہودیوں نے اسے مسیح ماننے سے تو انکار کردیا لیکن فلسطین جانے کا جذبہ قوی تر ہوگیا۔

انگریزوں کے روادارانہ رویے اور یہودیوں کی مجموعی سرگرمیوں کے باعث فلسطین کے بارے میں ایک مشترک دلچسپی فروغ پانے لگی۔ انگریز ملی نیریئنز (Millianarians) خصوصی طور پر معاون رہے۔ فلسطین کے امریکن اور برطانوی قونصل لارڈ ایشلی (Lord Ashley) وغیرہ نے ایسی سکیموں کی حوصلہ افزائی کی جن کے ذریعے فلسطین کے یہودیوں کو فائدہ پہنچانا مقصود تھا۔ یورپی طاقتوں نے سلطنت عثمانیہ میں مداخلت کے لیے "Eastern Question" کے عنوان سے ایک پالیسی وضع کر رکھی تھی جس کا بظاہر مقصد ان علاقوں کی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ تھا لیکن حقیقت میں سلطنت کو تباہ کرنا مقصود تھا۔ سیاسی مصنفین اس امر پر زور دے رہے تھے کہ فلسطین میں برطانیہ کے زیر انتداب ایک یہودی ریاست قائم کی جائے جو ہندوستان تک پہنچنے کے رستہ کو محفوظ بنانے میں معاون ثابت ہوگا۔ ہولنگز ورتھ (Holings Worth) نے ۱۸۵۲ء میں "Jew in Palastine" کے عنوان سے کتاب لکھی۔ جب لارنس اولیفنٹ (Laurance Oliphant) عثمانی خلیفہ سے آزاد یہودی کے لیے مذاکرت کر رہا تھا تو اسے لارڈ بیکن فیلڈ (Lord Beaconfield) اور لارڈ سالسبری (Lord Salisbary) کی پرزور حمایت

حاصل تھی۔ انیسوی صدی کے وسط میں Mosas Hess (۱۸۱۲ء ۔ ۱۸۹۵ء) مغربی یورپ میں Hireschkalish (۱۷۹۵ء۔۱۸۷۴ء) اور مشرقی یورپ میں صیونیت کی تبلیغ اور فروغ میں سرگرم تھے۔ اسی دوران یورپ میں یہودیوں کے خلاف ان کے رویہ کی وجہ سے جذبات ابھرے تو Lia Punsker (۱۸۲۱ء۔۱۸۹۱ء) نے یہودیوں کی آزادی کے لیے ایک ریاست کا مطالبہ کیا۔ اور ۱۸۹۶ء میں تھیوڈر ہرزل (Theoder Herzal) نے "یہودی ریاست" کے نام سے کتاب لکھی۔ جس میں اس ریاست کی تفصیلات تھیں۔ سکیم کو پورے یورپ میں پذیرائی حاصل ہوئی اور ۱۸۹۷ء میں جیوئش کانگریس منعقد ہوئی جس میں صیونی تنظیم قائم کی گئی جس کے ذمہ ان مقاصد کا حصول تھا جسے کانگریس نے پاس کیا تھا۔

ڈاکٹر ہرزل ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء میں سلطان عبدالحمید سے ملا اور یہودیوں کے لیے مراعات حاصل کرنے کی خاطر مذاکرات کیے لیکن ناکام رہا۔ تاہم یہودیوں کی آبادکاری کے لیے برطانوی و امریکی امداد مسلسل حاصل رہی۔ ۱۹۹۲ء سے ۱۹۱۴ء تک ۴۵۰۰۰ یہودی فلسطین میں آباد ہوئے۔ ۱۹۱۴ میں پہلی جنگ عظیم سے پہلے ان کی تعداد ۹۰۰۰۰ ہزار تھی۔

برطانوی دلچسپی کا اندازہ بالفور ڈکلیریشن (Balfour Declaration) سے ہو سکتا ہے جس کے یہ الفاظ قابل غور ہیں:

His Majesty's Government view with favour the establishtment in Palistine of a national home for the jewish people, and will use their best endeavours to facilitate the achievement of this object

اس اشتراک کو سمجھنے کے لیے آپ کی توجہ ایک اور پہلو کی جانب مبذول کرانا ضروری ہے اور وہ ہے ازمنہ وسطیٰ (Middle Ages) میں یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کا سلوک۔ اگر اس دور کی یورپی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو واضح ہوگا کہ یہودیوں پر سب سے زیادہ مظالم عیسائیوں نے کیے اور اس دوران یہ لوگ بھاگ بھاگ کر مسلمانوں کے ہاں پناہ لیتے تھے۔ انہوں نے مسلم سپین میں پناہ حاصل کی، عثمانی ترکوں کے ہاں پناہ حاصل کی اور شمالی افریقہ کی مسلمان ریاستوں میں پناہ حاصل کی۔ لیکن یہ عجیب قوم ہے جو اس کا محسن ہوتا ہے اسی کو کاٹ کھاتی ہے۔ مسلمانوں کے ہاں اسے پناہ ملی اور یہیں ان کی فکر اور ان کا فلسفہ پروان چڑھا۔ ان کا اہم فلسفی اور مفکر جو مسلمانوں کی تاریخ میں میمون اور یورپی مورخین کے ہاں Mimonides کے نام سے معروف ہے اور جسے یہودیوں کے ہاں بڑے مقام کا حامل تصور کیا جاتا ہے۔ یہ شخص غزالی کا ہمعصر اور غزالی ہی کی طرح بڑا مفکر ہے۔ یہودی فکر کے ارتقاء میں اس کا بڑا رول ہے۔ لیکن وہ کہاں

پروان چڑھا؟ مسلمانوں کے ہاں۔ اسے لکھنے کا موقع کہاں میسر آیا؟ مسلمانوں کے ہاں۔ اس نے اپنی تاریخ' اپنی فقہ اور آئیڈیالوجی کی تعبیر مسلمانوں کے ہاں رہ کر لکھی۔

آیئے اب اس پر غور کریں کہ اس دشمنی کے باوجود عیسائیوں اور یہودیوں میں مفاہمت کیسے پیدا ہوئی؟ یہ تو ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرتے تھے' ان کے درمیان مقاصد کا اشتراک کیسے پیدا ہوا؟ اس کو سمجھنے کے لیے عیسائیت کا جائزہ لینا ہوگا۔

جن لوگوں نے عیسائیت کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ عیسائیوں کے دو بڑے فرقے ہیں' ایک کیتھولک اور دوسرا پروٹسٹنٹ

کیتھولک عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ عیسیٰؑ کو سولی پر چڑھانے والے یہودی تھے لہٰذا یہودی مسیحؑ کے قاتل اور مسیحؑ کا خون یہودیوں کے سر ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو یہودیوں سے دشمنی عیسائی عقیدہ کا بنیادی پتھر ہے۔ گو اب پوپ نے ان کو اس جرم سے بری کردیا ہے۔ اس نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ مسیح کی مصلوبیت کا واقعہ ہماری تاریخ میں ہے لیکن میں معاف کرتا ہوں اور یہودیوں کو مسیحؑ کے قتل سے بری کرتا ہوں۔ ویٹی کن ثانی کے حکم نامہ Nostra Ectate ۲۸ر اکتوبر ۱۹۶۵ء اور Gentes Divintus مجریہ ۷ر دسمبر ۱۹۶۵ء کے مطابق یہودیوں کے قاتل قوم ہونے کا ہر عقیدہ ختم کردیا گیا۔

دوسرا فرقہ پروٹسٹنٹ کا ہے جو لوگ اس کی تاریخ اور اس کے ارتقاء پر نظر رکھتے ہیں وہ اس بات سے آگاہ ہیں کہ اسلامی تعلیمات کے اثر نے عیسائیوں کو اپنے عقیدے کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا اور پروٹسٹنٹ رہنماؤں پر اسلام کے تنقیدی نظریات کا اثر انداز ہونا بعید از امکان نہیں۔ ممکن ہے انہیں اثرات کے تحت اصلاح عقیدہ کی بحث چلی ہو لیکن اس کے اور اسباب بھی تھے اور ان میں ایک اور اہم عنصر یہودیوں کی سرگرمیاں تھیں۔ یہودیوں نے عیسائیت میں داخل ہو کر اسے ٹکڑے کرنے کی سکیم تیار کی اور وہ اس میں کامیاب ہوئے۔ پروٹسٹنٹ گروہ یہودیوں کے حامی ہیں لیکن عیسائیوں کے بعض فرقے ایسے ہیں جو صیہونیوں کے کھلے حمایتی ہیں۔ ایسے گروہ Zionist Christian کہلاتے ہیں۔ کچھ گروہ ایسے ہیں جنہیں Christian Jew کہنا چاہیئے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو بباطن یہودی ہیں لیکن ظاہری طور پر عیسائی ہوگئے ہیں تاکہ عیسائیوں میں پھوٹ ڈالنے کا کام کریں۔ اس مشن کی تکمیل میں وہ کسی قسم کا کام بھی کرسکتے ہیں۔

برطانیہ جسے صیہونیوں کی سرپرستی اور حمایت کا شرف حاصل ہے اور جنگ عظیم اول و دوم میں صیہونیوں نے جس کی کھلی حمایت کی تھی اس کا کلیسا جو "انگلیکن چرچ" کہلاتا ہے روم کے خلاف بغاوت پر مبنی ہے۔ چرچ آف انگلینڈ کے تمام فرقے مثلاً Baptist میتھوڈسٹ

(Mtehodist) ایونجلیکل (Evenglical) اور کانگری گیشنلسٹ (Congregationalist) وغیرہ' صیہونیوں کے حمایتی ہیں۔ یہودیوں نے عیسائیوں کے اندر داخل ہو کر ایسا کام کیا ہے کہ عیسائی نہ صرف ان کے مقاصد کی تکمیل میں مدد و معاون ہیں بلکہ انہوں نے یہودیوں کے دفاع کا کام بھی اپنے ذمہ لے لیا ہے۔ کیتھولک فرقہ میں جو تھوڑی مزاحمت تھی اس کو بھی انہوں نے توڑ دیا ہے۔

اینگلو سیکسن حمایت

یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مغربی تہذیب کے چار عناصر ترکیبی ہیں۔

۱۔ عیسائیت
۲۔ رومی قانون اور رومی عسکریت
۳۔ یونانی فلسفہ
۴۔ جاہلی رسوم و رواج یعنی (Pagan Customs) جو یورپ کے وحشی قبائل نے اپنا رکھے تھے۔

ان عناصر میں رومی عسکریت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ رومن ایمپائر مغربی ذہن سے محو نہیں ہوئی۔ تہذیبی غلبے میں عسکری غلبے کو خاص مقام حاصل ہے۔ ایک وقت تھا جب برطانیہ اپنے آپ کو رومن ایمپائر کا جانشین سمجھتا تھا اور اب امریکہ اس کی جانشینی کا دعویدار ہے۔ اگر غور کریں تو یہ اینگلو سیکسن پالیسی ہے۔ امریکہ اور برطانیہ اینگلو سیکسن گروپ ہے۔ عملاً" صورت حال یہ ہے کہ برطانوی دانشور کھل کر کہتے ہیں کہ برطانیہ امریکہ کا سیٹلائٹ ہے لیکن اگر ذرا تجزیہ کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ اب بھی جو بین الاقوامی پالیسی بنتی ہے اس کے تجزیہ میں اور اس کی تنفیذ میں برطانوی فکر' برطانوی سازش اور برطانوی ذہن کارفرما نظر آتا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ میں گہرا اشتراک موجود ہے۔ اور اسے قائم رکھنے اور مضبوط بنانے کی شعوری کوششیں ہوتی رہتی ہیں۔

اب ہم اس پر غور کریں گے کہ اینگلو سیکسن گروپ اور صیہونیت میں کتنا اشتراک ہے؟ یہ اشتراک اتنا واضح ہے کہ اس کے لیے کسی گہرے تجزیے کی ضرورت نہیں۔ یہ اشتراک ایک دوسرے کی مدد کے اصول پر مبنی ہے۔ اینگلو سیکسن گروپ عالمی غلبہ چاہتا ہے اور صیہونی اس کے مددگار ہیں۔ آگے چل کر پتہ چلے گا کہ اصل غلبہ کس کا ہو رہا ہے؟ لیکن سردست ہم اس اصول پر چل رہے ہیں کہ ایک گروپ دوسرے گروپ کی مدد کر رہا ہے اور مدد حاصل کر رہا ہے۔ یہ

برطانیہ ہی تھا جس نے یہودیوں کو فلسطین میں بسانے کے لیے عملاً مدد کی۔ یہ برطانیہ ہی تھا جس نے بالفورڈ ڈکلیریشن کے ذریعے صیہونی ریاست کی راہ ہموار کی۔ انسان حیران ہوتا ہے جب یہ پڑھتا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں مینڈیٹ پر عمل درآمد شروع ہوا اور ۱۹۲۵ء میں یروشلم میں ہیبریو (Hebrew) یونیورسٹی کا آغاز ہوا اور اس کا سنگ بنیاد لارڈ بالفور نے رکھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے یہودی ریاست کے قیام کا اعلان کیا تھا۔

جس وقت فلسطین برطانوی کنٹرول میں تھا اس وقت یہودیوں کے لیے سہولتیں پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ جدید تاریخ کا طالب علم جانتا ہے کہ اس سے پہلے جب فلسطین سلطنت عثمانیہ کا حصہ تھا اور صیہونیوں نے سلطان عبدالحمید سے جگہ حاصل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن کامیاب نہیں ہوئے تھے۔ برطانوی اور امریکی کوششوں سے صیہونیوں کو سہولتیں میسر آتی رہی تھیں اور ۱۹۱۳ء ۔ ۱۹۳۶ء کے درمیان دو لاکھ ۸۰ ہزار یہودیوں نے فلسطین میں رہائش اختیار کی۔ یہ انہی کی سازش تھی جس کے نتیجے میں ہر یہودی اپنے لیے جگہ خریدنے اور دیگر مالی معاملات کا فیصلہ کرتا۔

غور کریں تو معلوم ہوگا کہ صیہونیوں اور اینگلو سیکسن گروپ کے درمیان ایک اشتراک ہے۔ یہ اشتراک مفادات کا ہے۔ اینگلو سیکسن گروپ نے یہودیوں کو ایک ریاست مہیا کی اور یہودیوں نے ان کے لیے بطور کارکن کام کیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ یہودی ایک ایسی قوم ہے جو بہت دور تک سوچتی ہے۔ جب اینگلو سیکسن کی سرگرمیوں کا جائزہ لیں تو ان کی منصوبہ بندی میں بھی یہودیوں کا بنیادی رول نظر آتا ہے۔ لہٰذا اس حوالے سے صرف امریکہ و برطانیہ ہی کا تسلط نہیں بلکہ درپردہ یہودیوں کا ہی تسلط ہوتا ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں کوئی ایسا ادارہ نہیں اور کوئی ایسا انتظام نہیں جس کے تحت ہم اپنے مخالفوں کی زبان پڑھیں، ان کے لٹریچر کا جائزہ لیں اور اس کے بعد اپنی حکمت عملی مرتب کریں۔ جہاں تک یہودیوں اور عیسائیوں کا تعلق ہے تو ان کے کئی ادارے ہیں جو مسلمانوں کی سرگرمیوں اور ان کی حکمت عملیوں کا جائزہ لیتے رہتے ہیں۔ یورپ میں ایک اہم ادارہ جہاں اسلام پڑھایا جاتا ہے ایم اے اور پی ایچ ڈی کرنے کے لیے مسلمان اور غیر مسلم طلبہ داخلہ لیتے ہیں اور ایک بڑی تعداد یہاں آکر ڈگریاں حاصل کرتی ہے۔ اس ادارے میں ایک سیکشن افریقہ پر ہے، کوئی کانفرنس، کوئی پمفلٹ اور کوئی اشتہار ایسا نہیں جو وہاں نہیں پہنچتا۔ یہ سیکشن مقفل رہتا ہے۔ کوئی عیسائی طالبعلم یا سکالر استفادہ کرنا چاہے تو درست لیکن کسی مسلمان کے لیے وہاں رسائی ممکن نہیں۔ ادارے کا ایک مسلمان رکن وہاں چلا گیا تو وہاں موجود کارکن لرزہ براندام تھا معذرت سے کہا

کہ میری لیے مشکلات پیدا ہوں گی اس لیے آپ منتظم اعلیٰ سے اجازت لے کر آئیں۔ وہ شخص انتظام کا حصہ تھا اور عام علمی منصوبہ بندی میں شریک ہوتا تھا لیکن جہاں تک عیسائیت کے بارے میں حکمت عملی کا تعلق ہے اس سلسلے میں وہ کسی کو ہوا تک نہیں لگنے دیتے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہماری جامعات اور ہمارے کالجوں میں اسلام کے حوالے سے جو بات ہوتی ہے اس میں ان ہی لوگوں کو اتھارٹی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو غیر مسلم ہیں۔ حدیث کے بارے میں ان کی رائے' فقہ پر ان کا ریفرنس تاریخ حتیٰ کہ قرآن پر بھی ان کا ریفرنس قابل استناد ہے۔ سید مودودیؒ نے پہلے کہا تھا کہ اب معاملہ الٹا ہوگیا ہے مسلمان یورپ والوں سے پوچھتے ہیں کہ اسلام کیا ہے؟ اسلام کی تاریخ اور اس کی تہذیب کیا ہے حتیٰ کہ عربی زبان بھی مستشرقین سے سیکھی جاتی ہے۔ مغربی ممالک سے استاد درآمد کر کے ان سے اسلامی تاریخ پڑھوائی جاتی ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے متعلق جو کچھ وہ لکھتے ہیں' نہ صرف اسے پڑھا جاتا ہے بلکہ اس پر ایمان بھی لایا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ لوگ خود اپنے مذہب اور اس کی تاریخ کے متعلق اپنے ہم مذہبوں کے سوا کسی کی رائے کو ذرہ برابر دخل دینے کی اجازت نہیں دیتے۔"(۷)

آج تک کسی مسلمان نے سوائے سرسید کے بائبل کی تفسیر نہیں لکھی' اور سرسید نے بھی انگریزوں کو خوش کرنے کے لیے بائبل کی تفسیر لکھنی شروع کی تھی تاکہ یہ بتائیں کہ وہ بائبل کو بھی قرآن کے برابر سمجھتے ہیں۔ کسی مسلمان نے ان کے فلسفے' ان کی تاریخ اور ان کے مذاہب پر اظہار خیال کیا ہو اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی ہو؟ وہ اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ کوئی انہیں بائبل پڑھانے کے لیے آئے لیکن وہ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ ان کی یونیورسٹیوں میں اسلام پڑھایا جائے گا اور اسے یہودی اور عیسائی پڑھائیں گے۔ سید مودودیؒ نے کہا تھا کہ یہودی بھی کسی غیر یہودی کو اپنی تاریخ پڑھانے کی اجازت نہ دے گا لیکن مسلمان اپنی تاریخ کے لیے بھی اپنے معاملات کے تجزیے کے لیے بھی عیسائیوں اور یہودیوں کی تشریحات پر اعتماد کریں گے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم نے اس طرح کے انسٹی ٹیوشن نہیں بنائے جن میں ہم اپنے دشمن کے بارے میں تجزیہ کر سکیں۔ ہمارے قریب ہی ہندو بیٹھا ہے ان کے ہاں بہت کچھ ہندی میں ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں ہندی سمجھنے اور سمجھانے کے لیے کچھ نہیں ہو رہا۔ پنجاب یونیورسٹی میں ہندی کا ایک شعبہ ہے جس میں ایک غیر موثر انداز سے کام ہو رہا ہے نہ جامعہ کے ذمہ داران کو اور نہ نظامت تعلیم کو اس کا احساس ہے کہ اس شعبہ کو تعلیم و تدریس کے علاوہ تجزیہ و تجاویز کا کام بھی کرنا چاہیے۔ ہم حیرت سے دیکھتے ہیں کہ ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے لیکن ہمارے دشمنوں نے ہماری تاریخ' ہماری ثقافت' ہمارے دین اور ہمارے بنیادی ماخذ (Sources) کے بارے میں

ادارے قائم کر رکھے ہیں اور ہم ان اداروں سے استفادہ کرتے ہیں۔ برطانیہ میں ایک بڑے پادری نے کہا کہ اگر قرآن تمام انسانوں کے لیے ہے تو مجھے اس کی اجازت کیوں نہیں دی جاتی کہ میں اس کی تفسیر لکھوں؟ اس سے کہا گیا کہ بے شک آپ لکھیں آپ کو کون روکے گا؟ لیکن بڑی منافقت کی بات ہوگی کہ جس کتاب کو آپ خدا کا کلام ہی نہیں مانتے' جس کے بارے میں آپ کہتے ہیں ہ یہ شعر ہوسکتا ہے اور جسے آپ محمدؐ کی لکھی ہوئی کتاب سمجھتے ہیں اس کی تشریح کیسے کریں گے۔ آپ مجھے بتائیں کہ جس کو آپ اللہ کی کتاب نہیں مانتے اس کی تفسیر کس لیے کرتے ہیں؟ آپ کو ایسی کتاب کی تفسیر کا کیا حق ہے؟ اگر آپ اس کے مفہوم میں من مانی کرنے چلے ہیں تو یہ تحریف ہے اس کی کون اجازت دے گا؟ اور اگر آپ کے ذہن میں یہ ہے کہ آپ اسے سمجھیں اور سمجھائیں تو اس پر ایمان لائے بغیر کیسے سمجھیں گے اور کیا سمجھائیں گے؟ اس کا کوئی جواب اس کے پاس نہ تھا۔

اسلام' یہودیت' عیسائیت کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ مسلمانوں کو وہ رشتہ اپنے سامنے رکھنا چاہئے۔ اس رشتے اور اس تعلق کی وضاحت کے لیے آپ کے سامنے سورہ مائدہ کی آیت رہنی چاہئے:

لتجدن اشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين اشركوا و لتجدون اقربهم مودة للذين آمنوا الذين قالوا انا نصارىٰ ذلك بان منهم قسيسين و رهبانا و انهم لا يستكبرون۔ (۸)

اہل ایمان کی عداوت میں سے سب سے زیادہ سخت یہود اور مشرکین کو پاؤ گے اور ایمان لانے والوں کی دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا تھا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور نفس نہیں۔

لیکن دوسری آیت میں ان کے باہمی تعلق کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا:

يا ايها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارىٰ اولياء بعضهم اولياء بعض و من يتو لهم منكم فانه منهم ان الله لا يهدى القوم الظالمين۔ (۹)

اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ' یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی ان کو اپنا رفیق بناتا ہے تو اس کا شمار بھی پھر انہیں میں ہے۔ یقیناً" اللہ ظالموں کو اپنی رہنمائی سے محروم کر دیتا ہے۔

یہودیوں کو اسلام اور مسلمانوں سے جو عداوت ہے اس کی دو بنیادیں ہیں۔

۱۔ پہلی بنیاد پر سید مودودی نے بڑے خوبصورت انداز میں لکھا ہے۔ انہوں نے سورہ بنی اسرائیل کی آیت اسراء کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی آمد سے انسانیت کی روحانی قیادت بنی اسرائیل سے بنی اسمٰعیل میں منتقل ہوگئی ہے۔ اب دینی و روحانی رہنمائی محمد کریم ؐ کے ذریعہ ہوگی' اسرائیلی حوالوں سے نہیں ہوگی۔(۱۰)

اسی طرح آپ نے مسجد اقصیٰ کو آگ لگانے کے واقعہ پر "سانحہ مسجد اقصیٰ" لکھا ہے۔ اس پمفلٹ میں واقعات اور تجزیہ کے علاوہ اس کی تاریخی حیثیت متعین کی ہے۔

۲۔ دوسری اہم بات وہ واقعات ہیں جن کا تعلق یہودیوں کے اخراج سے ہے۔ عہد نبوی میں یہودیوں کو ان کی دشمنی' سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے مدینہ' خیبر اور فدک سے نکالا گیا تھا۔ اس اخراج کو وہ نہیں بھولے۔ حضور اکرم ؐ کی ذات اور اسلام سے ان کی دشمنی اتنی گہری ہے کہ اسے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ جس وقت انہیں موقع ملے گا وہ وار کریں گے۔

صیونیت ایک قومی و نسلی تحریک ہے اور اس کا ہدف عظیم تر اسرائیل (Greater Isreal) ہے۔ اگر اینگلو سیکسن گروپ کے تعاون سے وہ فلسطین پر قابض ہونے میں کامیاب ہوئے ہیں تو ان کی آئندہ نسلیں اسی الائنس کے ذریعہ عظیم تر اسرائیل بھی حاصل کریں گی۔ اس وقت مشرق وسطیٰ میں جو کھیل کھیلا جارہا ہے اس کے انجام سے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ بظاہر تو آثار ایسے نظر آتے ہیں کہ ان کے عزائم کی تکمیل میں کوئی بڑی رکاوٹیں نہیں' لیکن مشیت کے اپنے معاملات ہیں۔ قرآن مجید نے ان کی تاریخ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ انہیں نکالا گیا تھا اور پھر واپسی کا سامان کیا گیا۔ دوبارہ نکالا گیا اور تیسری بار وہیں لوٹ کر آرہے ہیں۔ قیامت کی علامات میں جو کچھ احادیث میں آیا ہے' اس کے مطابق یہودیوں کا سمٹ کر آنا آخری تصادم کی تیاری ہے جب پتھر بھی آواز دے گا کہ یہاں یہودی چھپا ہوا ہے۔(۱۱) اللہ بہتر جانتا ہے کہ مسلمانوں کی آزمائش کے لیے کیا باقی ہے؟ مسلمانوں کو تیسرے مرحلے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

طریق کار

صیونیوں نے اینگلو سیکسن گروپ کے اشتراک سے سیاسی و عسکری اور فکری و معاشی غلبے کے لیے جو منصوبہ بندی کی ہے اور اس کے لیے جو طریق کار اختیار کیا ہے اس سلسلے میں چند ایک امور قابل غور ہیں:

☆ ان کے طریقہ کار میں پہلی تدبیر دشمن کے بارے میں پوری معلومات اکٹھی کرنا ہے۔ وہ

متعلقہ قوم یا گروہ کے اندر ایسے داخل ہوتے ہیں کہ اس کی تہہ تک پہنچتے ہیں اور اس کے لیے انہیں جو ذرائع بھی اختیار کرنا پڑیں وہ اختیار کرتے ہیں۔ ہر ایک پہلو کا اندازہ کرتے ہیں اور جائزہ لیتے ہیں۔ علم کے ذریعہ' تجارت کے واسطہ' ذاتی تعلقات کی بنا پر' رشوت و لالچ کی بنا پر وہ مسلمان ملکوں کے اندر Infiltrate کرتے ہیں۔ ان کی سٹریجی ہے کہ مسلمان معاشروں اور حکومت کی تہہ تک پہنچ جائیں اور ان کا کوئی پہلو بھی ان سے پوشیدہ اور ان کی دستبرد سے محفوظ نہ ہو۔

☆ دوسری تدبیر یہ ہے کہ وہ قوموں کے اندر فکری الحاد و کجروی پیدا کرتے ہیں۔ قوموں کی تاریخ ان کے عقائد' ان کی ثقافت اور ان کے فکر و عمل میں distortion پیدا کرتے ہیں۔ قومی وحدت اور ملی یگانگت کو مجروح کرتے ہیں یوں قومیں جب انتشار کا شکار ہوتی ہیں تو ان کے مقاصد کی تکمیل میں ممد و معاون بن جاتی ہیں۔ ہماری تاریخ میں عبداللہ بن سبا انتشار و الحاد کا نقطہ آغاز ہے۔ اسماعیلی' بہائی' قادیانی وہ بنیاد ہیں جہاں سے defection پھیلانے کی کوشش کی گئی۔ ان تنظیموں کی حیثیت امت مسلمہ کی Anti Body کی ہے۔

ع نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن

☆ تیسری چیز جو Global domination کے لیے راہ ہموار کرتی ہے۔ وہ مسلمان معاشروں کی رکنیت ہے۔ مسلمان معاشرے ان کی فکری اطاعت اور عملی پیروی کر رہے ہیں۔ مغرب نے پوری دنیا کو کنٹرول کرنے کے لیے تین سبق پڑھائے ہیں۔ ان کی حیثیت مسلمات کی ہوگئی ہے کوئی شخص انہیں چیلنج نہیں کرسکتا اور کوئی ان سے اختلاف نہیں کرسکتا۔ جو اختلاف کرے گا اس کے لیے انہوں نے الزامات گھڑ رکھے ہیں۔ انتہا پسند' بنیاد پرست' دہشت گرد' تنگ نظر' رجعت پسند۔ ادھر اختلافات کی جرات ہوئی ادھر الزامات کی بوچھاڑ شروع ہوگئی۔ مسلمانوں کی اندر ہی ان کے ایجنٹ ان کا دیا ہوا فریضہ انجام دینے لگیں گے۔ ان مسلمات میں سے تین کی حیثیت عقیدہ کی ہے۔

۱۔ سیکولرائزیشن (Secularization)

۲۔ (Democratization)

۳۔ (Commercialization)

سیکولرائزیشن

سیکولرائزیشن وہ اصل طریق کار ہے جس کے ذریعے پوری دنیا کو مغربی طرز فکر و عمل سے

ہم آہنگ کرنا ہے۔ یہودیوں کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ غیر یہودی مذاہب ہیں۔ لہٰذ ان کا اولین ہدف مذہبی تاثیرات کو ختم کرنا ہے۔ اولین طور پر یورپ میں سیاسی و معاشی دائروں میں عیسائیت کو بے اثر کیا اور پھر پوری دنیا میں مذہب کے خلاف مہم چلائی۔ سیکولرائزیشن میں تین اہداف پیش نظر رکھے گئے۔

۱۔ مابعد الطبیاتی ماخذ کی تحقیر کی گئی۔ چونکہ الہامی مذاہب کی بنیاد الہ پر ہے اس لیے اسے غیر عقلی اور غیر سائنسی نظریہ قرار دیا گیا ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی گئی کہ دنیا میں حقیقت ہے اس سے ماوراء کوئی شے نہیں۔ ایک مرتبہ خدائی حوالہ بے اعتبار ہوجائے تو ہر کام آسان ہوجاتا ہے۔

۲۔ مستقل نظام اقدار کی نفی کی گئی تاکہ ہر قدر (Value) کی حیثیت اضافی ہوجائے اور وقت کے ساتھ ساتھ اقدار بھی بدلتی جائیں۔ مذہب چونکہ ایک Value System رکھتا ہے۔ لہٰذا نظام اقدار کے عارضی ثابت ہونے سے مذہب کی گرفت ازخود ختم ہوجائے گی اور معاشرے بداخلاق' بے راہ اور آوارہ منش ہوجائیں گے۔ اخلاقی اقدار اگر قابل تبدیل ہیں تو کوئی ضابطہ اخلاق بھی باقی نہیں رہے گا اور یوں انسانوں کو انفرادی طور پر اور معاشروں کو اجتماعی طور پر اخلاق باختہ' بے حیا اور بدکردار بنایا جاسکے گا۔ مغرب میں جنسی صنعت' ذرائع ابلاغ اور تفریحی ادارے یہودیوں کے کنٹرول میں ہیں۔ انہوں نے تفریح کے نام پر عریانی' فحاشی اور بے راہ روی کو فروغ دیا ہے۔ امریکہ و یورپ میں پوری طرح کامیاب ہیں اور اسلامی دنیا میں بھی راہیں پیدا کرلی ہیں۔

۳۔ سیاست کو مذہبی اخلاق سے آزاد کرایا گیا۔ ریاست اور اس کے تمام ادارے مذہب و اخلاق سے غیر متعلق کردے گئے۔ سیاست اہل ثروت کا کھیل ہے جس میں صرف وہی لوگ شامل ہوسکتے ہیں جو ایک مالی پوزیشن کے حامل ہیں۔ پارٹی سسٹم بھی ایک خاص نہج پر منظم ہے۔ مغربی ممالک کے پارٹی سسٹم میں یہودی پوری طرح دخیل ہیں۔ سیاست کو مذہب سے الگ رکھنے کا نظریہ یورپ میں اپنا لیا گیا ہے اور اسلامی دنیا میں اسے نافذ کرنے کی کوششیں جاری ہیں۔ ریاست پوری قوت کے ساتھ مذہب و اخلاق کے حوالے کو سیاست سے دور رکھتی ہے۔

ان تینوں معیارات کے لحاظ سے مغربی معاشرہ ایک سیکولر معاشرہ ہے لیکن یہودیوں نے اپنا تشخص برقرار رکھا ہوا ہے۔ امریکہ و یورپ میں یہودیوں کے خلاف بات کرنا ایک امر محال ہے۔

ڈیموکریٹائزیشن

جمہوری عمل بظاہر پرکشش ہے کہ عوام کو آزادی دی گئی ہے کہ وہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں لیکن عملاً وہ رائے کا اظہار صرف ایک مرتبہ کرتے ہیں اور وہ بھی کسی دوسرے کو ووٹ دینے کی حد تک اور اس کے بعد وہ حکومت کے رحم و کرم پر ہیں۔ زیادہ سے زیادہ انہیں یہ حق ہے کہ وہ مظاہرے کریں اور اگر کوئی پریشرگروپ ہے تو اپنی رائے کے بارے میں لابی کرے اور اہل اختیار کو آمادہ کرلے۔ جمہوری عمل کا اصل ہدف مذہبی فریم ورک ہے۔ چونکہ دینی علم رکھنے والے دین کے حوالے سے جائز و ناجائز اور حلال و حرام کی بات کرتے ہیں جو مستقل نظام اقدار کے دائرہ میں آتی ہے اس لیے انہیں بے اثر کرنے کے لیے رائے عامہ کی بات کی جائے۔ عامۃ الناس کی ایسی تنظیم کی جائے تو دینی حوالوں سے بات کرنے والوں کے مدمقابل کھڑی ہوں' ان کی تحقیر کرے اور انہیں بے تاثیر کردے۔

جمہوری عمل کے نام پر ایسی ہلڑبازی' ایسی دھونس اور دھاندلی کی جائے کہ شرفاء کے لیے کوئی اقدام کرنا ناممکن ہوجائے۔ ایک مرتبہ اصحاب الرای غیر موثر ہوگئے تو عوام کو بے راہ رو کرنا آسان ہوجائے گا۔ یہی وہ پالیسی ہے جس پر یہودی ایجنسیاں مصروف عمل ہیں۔ ہر مغربی حکومت اس جمہوری عمل کو تعلقات کے لیے اولین شرط قرار دیتی ہے۔ اسلام کا شورائی نظام عوامی جمہوریت سے کہیں زیادہ بہتر اور نفع بخش ہے۔ سید مرحوم نے اس کے لیے Theodemocracy کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلم جماعتیں اس کا صحیح ادراک نہیں کرسکیں اور عوامی ہڑبونگ میں شریک ہوگئیں۔

کمرشلائزیشن

یہودیوں نے اپنے ہاں سے آخرت کا تصور نکال دیا ہے وہ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے دنیا پرستی کے لیے کئی فلسفے گھڑ لیے ہیں۔ خدا کو بے دخل کرنے' اخلاقی قدروں کو پامال کرنے اور دینی حوالوں کو بے اثر بنانے میں انہوں نے ہر حربہ استعمال کیا ہے۔ ان کے نزدیک ہر شئے خریدنی و فروختنی ہے۔ سودی نظام ان ہی کی کارستانی ہے۔ مادہ پرستی ان ہی کا نظریہ ہے۔ انسانی زندگی کو ایک مادی مشین بنا دینے کے بعد ہر چیز کو قابل خرید و فروخت کرنا ہے۔ ایک وقت تھا جب اشتراکی فلسفے کے تحت نیشنلائزیشن منفعت بخش نعرہ تھا اور اب Privatization عالمی نعرہ ہے۔ انہوں نے پوری دنیا کو مجبور کیا ہے کہ اپنے وسائل ملٹی نیشنلز کے سامنے رکھ دیں۔ مزدور' طریق محنت' وسائل پیداوار' صنعتکاری و زراعت تنظیم و تنفیذ سب

پر کا ان کاکنٹرول ہے یا ان کی ہدایات نافذ ہوتی ہیں۔ تمام بین الاقوامی ادارے ان کے زیر تصرف ہیں۔ عالمی فنڈ' عالمی بینک' تخفیف اسلحہ' خاندانی منصوبہ بندی' ماحولیاتی تحریکیں' آزادی نسواں تحریکیں' حقوق انسانی کی تنظیمیں' سب ان کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ مغرب میں ایسی تنظیمیں موجود ہیں جو لوگوں کو خودکشی کی سہولتیں فراہم کرتی ہیں اور رہنمائی کرتی ہیں۔ یو تھینزیا (Euthanasia) یعنی خود پسند موت ایک اہم مسئلہ ہے جس کے اخلاقی و قانونی پہلوؤں پر مغرب میں بحثیں ہو رہی ہیں۔ یہودیوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ان کی تعداد محدود ہے اس کی حفاظت کرنا ان کا فرض ہے۔ رہے غیریہودی تو ان کی ہلاکت' ان کی نسلوں کی تباہی اور فصلوں کی بربادی ان کا مقصد حیات ہے اس کے لیے وہ نت نئے طریقے ایجاد کرتے رہتے ہیں۔

یہ ہے وہ طریق کار جس کے ذریعے وہ مسلمان معاشروں میں مداخلت کرتے ہیں۔ ان ہی طریقوں سے انہوں نے مسلم امہ میں راہیں (inroads) پیدا کی ہیں اور اسے غیر مستحکم' منتشر بلکہ حواس باختہ کردیا ہے۔ صیہونیوں کا اپنا مفاد اس میں ہے کہ مغربی ملکوں کی وحدت قائم ہو۔ امریکہ کی مختلف ریاستوں کی وحدت میں صیہونیوں کو Infiltrate کرنے کی آسانی تھی لیکن یورپ کے مختلف ملکوں اور مختلف دارالسلطنتوں کی وجہ سے دقتیں پیش آرہی تھیں لہٰذا انہوں نے سارے یورپ کو متحد ہونے کا نعرہ دیا۔ یورپ ایک ہوجائے گا۔ ایک پارلیمنٹ ہوگی' ایک مالیاتی نظام ہوگا اور ایک انتظامی پالیسی ہوگی تو یورپ کو کنٹرول کرنا آسان ہوگا۔

دوسری طرف ان کی پالیسی کا حصہ ہے کہ عالم اسلام مزید ٹکڑوں میں بٹے' صنعتی ترقی نہ ہو' زراعت تباہ ہو' وسائل پر یورپ اور امریکہ کا قبضہ ہو' حکمران دست نگر ہوں' پالیسیاں مغربی ادارے تشکیل دیں۔ عالم اسلام ایک ہجوم اور ایک بھیڑ ہو جسے ہانکنے والے مقامی حکمران ہوں اور ہدایات دینے والے بین الاقوامی ادارے ہوں۔ ہمارے حکمران اس کام کے لیے ابھی سے تیار بیٹھے ہیں۔ قومی وسائل کی نیلامی' کثیرالقومی کمپنیوں کا نفوذ بالآخر استعماری قوتوں کے کنٹرول پر منتج ہوگا اور مسلمان معاشرے اپنے سیاسی رہنماؤں کے مرثیے پڑھتے ہوئے اور اپنی غلامی کا ماتم کرتے ہوئے صرف اتنا کہہ سکیں گے ع

قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند

❖❖❖

حواشی

۱۔ انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن اینڈ اینتھکس، ۳۸۹/۵

۳۔ ایضاً

۳۔ ابو داؤد السنن، کتاب الملاحم، باب ما یذکر...، ۴۸۰/۴

۴۔ خطبات اقبال، ۶۴

۵۔ الصف / ۹، الفتح / ۲۸

۶۔ ترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء فی لزوم الجماعة، ۴۶۶/۴

۷۔ ترجمان القرآن، نومبر ۱۹۶۱ء

۸۔ المائدہ / ۸۲

۹۔ المائدہ / ۵۱

۱۰۔ تفصیلات کے لیے سید مودودی کی "معراج" پر تقریر دیکھئے۔

۱۱۔ ترمذی، کتاب الفتن، باب ماجاء فی علامة الدجال، ۵۰۸/۴